سلسلہ مطبوعات ۶۸

مبادیِ تاریخ

www.ahlehaq.org

مفتی سعید الرحمٰن

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

سلسلہ مطبوعات ۶۸

مبادیٔ تاریخ

www.rahimia.org

مفتی سعید الرحمٰن

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مبادی تاریخ

نظام المدارس الرحیمیہ ۔ پاکستان کے زیر اہتمام ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور میں دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے درس نظامی کے نصاب پر تربیتی ورکشاپ یکم اگست ۲۰۰۲ء کو منعقد ہوئی، جس میں ملک کے معروف محققین نے علمی تقاریر کیں اور تحقیقی مقالے پیش کیے، زیر نظر مضمون پروفیسر ڈاکٹر مفتی سعید الرحمن کی تقریر ہے، جسے جناب محمد اصغر علی ضبط تحریر میں لائے اور نوک پلک مولانا ناصر عبدالعزیز نے سنواری، قارئین کے استفادہ کے لیے پیش ہے۔ (ادارہ)

www.rahimia.org

تاریخ ایسا علم ہے جس کے ذریعے انسانی معاشروں کو اپنے ماضی سے آگاہی حاصل ہوتی ہے اور اس آگاہی کی وساطت سے وہ اپنے بہتر مستقبل اور حال کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک بڑا مربوط عمل ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں جو تاریخ کا تصور موجود ہے یا جو کتابیں لکھیں گئی ہیں اس میں محض واقعات کا تذکرہ ہوتا ہے اور واقعات کا تذکرہ بھی لکھنے والے کی اپنی منشاء کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جتنی بھی تاریخ لکھی جاتی ہے وہ درحقیقت لکھنے والے کی اپنی کچھ خواہشات ہوتی ہیں یا اس کے اپنے کچھ اندیشے ہوتے ہیں۔ اسکی کسی گروہ سے کچھ ناراضگیاں ہوتی ہیں یا کسی گروہ سے بہت زیادہ خوش فہمیاں ہوتی ہیں۔ ان کو وہ الفاظ کا روپ دے کر تاریخ کے نام سے پیش کر دیتا ہے جس کی

وجہ سے تاریخ محض کچھ خوش فہمیوں کا نام بن جاتا ہے یا کچھ غلط فہمیوں کا وہ ایک مجموعہ ہوتا ہے۔اس تناظر میں ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ تاریخ اصل میں ہوتی کیا ہے اور یہ ہمیں اسی وقت پتہ چلے گا کہ جب ہم اس کے فلسفہ کو متعین کریں گے، تاریخ کا فلسفہ کچھ قوانین پر مشتمل ہے جب تک ہمیں ان قوانین سے آگاہی نہیں ہوگی اس وقت تک ہم صحیح معنوں میں تاریخ کو نہیں جان سکتے۔

قانون وحدت:۔

سب سے پہلا اور بنیادی قانون جو تاریخ کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے وہ قانون وحدت ہے۔اس کا مطلب یہ کہ بہت سے انسانی معاشرے دنیا میں موجود رہے ہیں۔یہ تمام انسانی معاشرے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ یوں جڑے ہوئے ہیں جیسے ایک اکائی ہوتی ہے ،اکائی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اس کو مختلف اجزاء میں اس طرح تقسیم نہیں کر سکتے کہ ایک جزو کا تجزیہ آپ کچھ کریں اور دوسرے جزو کا تجزیہ اس سے مختلف ہو۔اگر کسی جگہ مختلف اکائیاں ہوں پھر تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک اکائی ایک قسم کی ہے اور دوسری اکائی اس سے مختلف ہے لیکن جب ہم پورے انسانی معاشرے اور پوری انسانی سوسائٹی کو ایک اکائی سمجھیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس تناظر میں ہم ماضی کا جائزہ لیں گے اسی تناظر میں ہم حال کو بھی دیکھیں گے اور اسی تناظر میں ہم مستقبل کا منصوبہ بھی تیار کریں گے چنانچہ آج کے دور میں جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ ہمیں کیا کیا چیزیں متاثر کرتی ہیں اور ہم معاشرے کے اندر رہتے ہوئے کن کن عوامل سے متاثر ہوتے ہیں۔تو یہی عوامل ماضی میں بھی متاثر کرتے تھے اور یہی عوامل مستقبل میں بھی متاثر کریں گے جیسے ہم اپنی جغرافیائی صورتحال سے متاثر ہوتے ہیں، ہم اپنے معاشی نظام سے متاثر ہوتے ہیں، ہم دوسری قوموں سے جو باہمی ربط وضبط رکھتے ہیں، اس کے اثرات ہم پر پڑتے ہیں اور ہمارے سیاسی نظام کا ایک اثر ہم پر موجود ہوتا ہے۔تو بہت ساری چیزیں مل کر ہمارے حال کو ایک شکل دے رہی ہیں۔اب جیسے ہم اپنے حال میں بہت سارے عوامل تلاش کرتے ہیں اور ان عوامل کو ہم آپس میں ایک

دوسرے سے متعلق سمجھتے ہیں تو اسی انداز پر ہمیں ماضی کا بھی جائزہ لینا ہوگا۔

اس تاریخی عمل کو یا فلسفہ تاریخ کو سمجھنے کے حوالے سے ہمیں ابن خلدون جیسی معروف اور معتبر شخصیت سے مدد ملتی ہے۔ ابن خلدون نے مقدمہ کے نام سے ایک کتاب لکھی (ویسے تو اس کی کتاب کا ایک طویل نام ہے جو اس کی کتاب پر مذکور ہے) اس مقدمہ میں اس نے تاریخ کا ایک فلسفہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ چیز بھی ہم پیش نظر رکھیں کہ ابن خلدون نے ایک تاریخ بھی لکھی ہے۔ لیکن اپنے مقدمہ میں اس نے جو ایک معیار قائم کیا تھا اور جو اس نے اصول بنائے تھے اس پر اسکی اپنی تاریخ بھی پوری نہیں اترتی یہ اس کی تاریخ میں کمزوری ہے، لیکن اس نے جو ایک مقدمہ لکھا ہے یا جو اس نے ایک تاریخ کا فلسفہ متعین کیا ہے وہ یقیناً ایک بہت ہی اہم چیز تسلیم کی گئی۔ صرف مسلمان مورخین نے ہی نہیں بلکہ غیر مسلم مورخین نے بھی تسلیم کیا ہے اور خاص طور پر یورپ کے میں جو احیاء علوم کا دور کہلاتا ہے اس دور میں بھی ابن خلدون کو ایک بڑی ہی ممتاز حیثیت دی گئی۔

ابن خلدون نے قانون وحدت کے حوالے سے تاریخ کے بعض واقعات پر تنقید کی ہے کہ تاریخ میں کسی خاص قوم کا نام لے کر یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ قوم اپنا وجود آج کے لوگوں سے مختلف رکھتی تھی کہ اس میں غیر معمولی طور پر بہت لمبے ڈیل ڈول کے لوگ تھے تو وہ تاریخ کے اس اصول کے تحت اس کا انکار کرتا ہے۔ اس ضمن میں اس نے خاص طور پر قوم عمالقہ کا نام لیا ہے اس کے بارے میں تاریخ میں جو لکھا جاتا ہے کہ یہ غیر معمولی قد کے لوگ تھے یا اسی طرح ہمارے ماضی کے دیگر انسان بہت ہی غیر معمولی جسامت رکھتے تھے اور یہ شبہ اس سے ہوا کہ بڑی بڑی غاریں اور بڑے بڑے محلات اور اس طرح کے جو کچھ آثار قدیمہ ملے ہیں اس سے لوگوں نے اندازہ کیا کہ شائد یہ کوئی غیر معمولی جسامت کے لوگ تھے۔ اور یہ کہ پھر آہستہ آہستہ لوگوں کے قد گھٹتے چلے گئے۔ اس کا اس نے انکار کیا کہ یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ انسانی معاشرہ ایک اکائی کی مانند ہے تو جس طرح آج کا انسان ہے ماضی کے انسان بھی اسی طرح کے تھے یہ ضرور ہوسکتا ہے اور اس میں کسی قسم کے شبہ کی بات نہیں کہ نسبتاً زیادہ بڑے قد کے

www.rahmia.org

لوگ ہوں لیکن غیر معمولی چیزیں وہاں موجود نہیں تھیں۔ غرض یہ کہ قانون وحدت ایک بڑی بنیادی چیز ہے۔ اسی قانون کے ذریعے ہی ہم تاریخ سے صحیح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگر ہم اس قانون کا انکار کر دیں تو اس کا مفہوم یہ نکلے گا کہ ماضی بالکل مختلف چیز تھی اور معلوم نہیں کہ مستقبل کتنا مختلف ہوگا، اس طرح ہم مستقبل کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں کر سکتے یعنی ایک غیر یقینی صورتحال ہوگی جس میں ہمیں مستقبل کے حوالے سے تاریخ کوئی مدد نہیں دیتی سوائے ایک قصہ کہانی کے کہ جس سے لوگ لطف اندوز ہوں یا اس سے کوئی اذیت محسوس کریں۔ تو اس لیے تاریخ کو سمجھنے کے لئے اس قانون کو خاص طور پر ایک بنیادی اہمیت دینا ہوگی۔

قانون ربط:

اسی طرح ایک اور چیز جو اس کے فلسفہ تاریخ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے وہ ہے قانون ربط، جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح زمانہ، زمانہ کے ساتھ جڑا ہوا ہے اسی طرح انسانی زندگی کے مختلف شعبے بھی آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی الگ تھلگ چیزیں نہیں، قوموں کے عروج وزوال کو قرآن حکیم نے خاص طور پر ذکر کیا ہے اور اسی چیز کو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تذکیر بایام اللہ کے نام سے ایک مستقل علم قرار دیا ہے تو یہ علم اسی صورت میں ایک حقیقت پیدا کرے گا کہ جب ہم اسکو قانون ربط کے اصول پر دیکھیں گے کہ جیسے آج کا زمانہ پچھلے زمانہ سے مربوط ہے اور کل کا زمانہ پرسوں کے زمانہ سے مربوط ہے یا اسی طرح آنے والا زمانہ ہمارے زمانہ سے جڑا ہوا ہے۔ تو یہ تمام زمانے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں جڑے ہوئے ہیں، اور اسی ربط کے نتیجے میں یہ معاشرہ آگے بڑھ رہا ہے۔ اسی طرح انسانی زندگی کے شعبے بھی آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ انسانی زندگی کو ہم مختلف جزیروں میں نہیں بانٹ سکتے۔ وہاں پر سیاست، معیشت کے ساتھ، معیشت، اخلاق کے ساتھ، اخلاق، تعلیم کے ساتھ اور اسی طرح تعلیم، عمرانیات کے ساتھ گویا یہ ساری چیزیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ متعلق ہیں۔ ان کو ہم ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کر سکتے چنانچہ یہ نظریہ کہ ''معیشت ایک علیحدہ چیز ہے اس کو آپ اپنی جگہ پر رہنے دیں وہ جیسی تیسی بھی گذرتی ہے مگر آپ اپنے اخلاق

اچھے کرلیں'' ظاہر ہے کہ یہ بہت خام سوچ ہے۔اسی طرح یہ نظریہ کہ ''بنکنگ کو درست کرلیں اور باقی معاشی نظام جوں کا توں رہنے دیں تو حالات میں بہتری آجائے گی''۔

حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کی درستگی کے لیے ضروری ہے کہ معیشت بھی صالح ہو ،معیشت کے صالح ہونے کے لیے سیاست کا صالح ہونا ضروری ہے،اسی طرح اخلاق کی درستگی اور صالح ہونے کے لیے تعلیم کا صالح ہونا ضروری ہے۔گویا شعبوں کے صالح ہونے کے لئے نظام کا صالح اور عادل ہونا ضروری ہے۔اس طرح یہ تمام چیزیں آپس میں مربوط ہوں گی تو پھر جا کر ایک بہتر نتیجہ نکلتا ہے۔اور اگر ہم اس ربط کو توڑ دیں گے تو پھر اس کے نتیجہ میں معاشرہ کے اندر گروہیت پیدا ہوگی۔اور معاشرہ کے اندر مختلف ایسے گروہ وجود میں آجائیں گے کہ جو مختلف شعبہائے حیات کو اپنے اپنے زاویے سے دیکھیں گے اور اس کی اصلاح کے لیے یا اسکی بہتری کے لیے اپنی اپنی تجاویز دیتے رہیں گے لیکن جب تک ہم ان تمام شعبوں میں ربط کو تلاش نہیں کریں گے اور اس میں قانون ربط کی بنیاد پر تاریخ کو نہیں دیکھیں گے تو ظاہر ہے کہ ہم صحیح طور پر اس دور کی پہچان پیدا نہیں کر سکتے۔اسی وجہ سے جب ہم ماضی میں جائیں گے تو ماضی میں ہمیں یہ جاننا پڑے گا کہ اس قوم کے خیالات وتصورات کیا تھے؟اس قوم کا رہن سہن کس قسم کا تھا؟اس قوم کی معیشت کس قسم کی تھی؟اس قوم کا نظام سیاست کس قسم کا تھا؟ کہ جس کے نتیجہ میں اس معاشرہ کے اندر برتری یا بدتری پیدا ہوئی کہ کبھی ہم معاشرہ کو برتر سمجھتے ہیں کہ اچھا معاشرہ ہے اور کبھی ہم کہتے ہیں کہ وہ معاشرہ بہت گر گیا ہے اور بدتر بن گیا ہے لہذا اس چیز کو جانچنے کے لیے ہم ایک شعبے کو نہیں دیکھتے بلکہ اس قانون ربط کی بنیاد پر ہم تمام شعبوں کا جائزہ لیکر فیصلہ دیتے ہیں کہ اب اس دور کو ہم کس منزل پر یا کس مرحلہ پر دیکھیں۔

قانون ارتقاء:۔

اسی قانون ربط سے ہی جڑا ہوا ایک اور قانون ہے جسے قانون ارتقاء کہتے ہیں،یہ بہت اہم چیز ہے کہ معاشرہ کے اندر آدم علیہ السلام سے لیکر آج تک ایک سماجی ارتقاء کا عمل

موجود ہے معاشرہ کے اندر آگے بڑھنے کا عمل موجود ہے جب ارتقاء رُکتا ہے تو پھر معاشرہ کے اندر فساد برپا ہو جاتا ہے اور اس فساد کو ختم کرنے کے لیے اس دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ کا اپنا جو نظام موجود ہے وہ پھر کارفرما ہوتا ہے تو اس کا ایک نتیجہ سامنے آتا ہے چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہؒ اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ دنیا میں جو سب سے پہلا معاشرہ پیدا ہوا وہ حضرت آدم علیہ (السلام) سے پیدا ہوا اور آدم علیہ (السلام) نے ارتفاق اول کی بنیاد پر ایک سوسائٹی قائم کی آگے چل کر اگلے ارتفاق کی بھی کچھ جھلکیاں ہمیں ملتی ہیں پھر حضرت ادریس علیہ (السلام) نے اسکو مزید بہتر کیا، آگے بڑھایا اور انہوں نے ارتفاق اول کو ایک ترقی یافتہ شکل دی اس کے بعد درمیان میں یہ ارتقاء کا عمل ایک مرتبہ رُکا اور معاشرہ کے اندر جاہلیت پیدا ہوئی جس کو شاہ ولی اللہؒ جاہلیت اولیٰ کہتے ہیں اس جاہلیت اولیٰ کو توڑنے کے لیے اور اس قانون ارتقاء کو دوبارہ جاری و ساری کرنے کے لیے حضرت نوح علیہ (السلام) کی آمد ہوتی ہے وہ لوگوں کو اس جاہلیت اولیٰ کے نتائج سے خبردار کرتے ہیں کہ یہ جاہلیت تمہیں برباد کر کے رکھ دے گی چنانچہ ان کی پوری زندگی کی جدوجہد اس جاہلیت کو مٹانے کے لیے صرف ہوئی اور پھر جب یہ جاہلیت اس عمل سے جو انہوں نے اختیار کیا اس کے ایک منطقی نتیجہ تک پہنچتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے طوفان نوحؑ آیا اور وہ جاہلیت مٹا دی گئی اور ایک نیا صالح معاشرہ پیدا ہوا پھر قرآن نے قوم عاد اور قوم ثمود کا ذکر کیا اس جاہلیت کو انہوں نے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی جس کو ان انبیاء نے اپنے اپنے دور کے اعتبار سے اور اس دور کے معروضی حالات کے مطابق ختم کرنے کی کوشش کی مگر وہ ایسا دور تھا جب تنظیم پیدا نہیں ہو سکتی تھی تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو قانون موجود ہے وہ کارفرما ہوا اور قومیں تباہ ہوئیں تو غرضیکہ قانون ارتقاء کو جب بھی روکا جائے گا تو اس روکنے کے نتیجہ میں معاشرہ کے اندر ایک تبدیلی آئے گی اگر یہ تبدیلی معاشرہ کے اندر افراد اپنی تنظیم کے ذریعے پیدا کر لیتے ہیں تو اسکو آپ انقلاب کہتے ہیں اور اگر وہاں تنظیم پیدا نہ ہو سکے یا وہ افراد اتنے طاقت ور نہ ہو سکیں تو پھر ایک قانون قدرت وہاں پر روبہ عمل آتا ہے اور اس قانون قدرت کو آپ قیامت کہتے ہیں یعنی ایک

www.tanzeem.org

چھوٹی قیامت برپا ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں مدوجزر پیدا ہوتا ہے اور پچھلی جاہلیت کو ختم کیا جاتا ہے اور ایک صالح معاشرہ پیدا کیا جاتا ہے۔

غرضیکہ دور کے اس طرح آگے بڑھتے بڑھتے ایک ایسا وقت آیا کہ معاشرہ کے اندر پھر قانون ارتقاء رکا، اب یہ جو قانون ارتقاءُ کا تو اس کے اندر اقترابات کا نظام بھی خراب ہوا اور ارتفاقات کا نظام بھی ایک جگہ پر آکر رک گیا اور جمود پیدا ہو گیا اس کو شاہ ولی اللہؒ جاہلیت ثانیہ کہتے ہیں، اس جاہلیت ثانیہ کو مٹانے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام آتے ہیں چنانچہ انہوں نے یہاں پر ایک اگلا مرحلہ شروع کیا جس میں انہوں نے براہ راست نفس انسانی، روح انسان اور انسانی ضمیر کو مخاطب کیا۔ یہاں سے گویا اس جاہلیت کے خلاف وہ ایک بھرپور جدوجہد کا آغاز کرتے ہیں پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ جدوجہد آگے بڑھتی ہے اور یہ جدوجہد اتنی بھرپور اور اتنی ہمہ گیر ہے کہ ہر پہلو سے انہوں نے اس نظام جاہلیت کی سیاست کو بھی چیلنج کیا، اسکے نظام معیشت کو بھی چیلنج کیا، اس کے نظام اخلاق کو بھی چیلنج کیا اور قربانی کا آپ نے ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ یہاں سے گویا فطرت انسانیہ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ یہ دور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب ہوتا ہے اور حنفی کہلاتا ہے۔

ملت حنفی کے مختلف ادوار میں اپنے اپنے معروضی تقاضوں کے مطابق مختلف شکلیں پیدا ہوتی رہیں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی ایک تعبیر کی اور انہوں نے بھی اسی طرز پر کام کیا جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے دور کے نظام کو چیلنج کیا تھا اور مقابلہ کیا، اور اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے دور کے نظام کو چیلنج کیا اور آزادی کی ایک جدوجہد لڑی۔

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد قانون ارتقاءُ کا تو ارتفاقات کا نظام بھی متاثر ہوا اور اقترابات کا نظام بھی متاثر ہوا۔ جس کو شاہ ولی اللہؒ جاہلیت ثالثہ کہتے ہیں۔ یہ تیسری جاہلیت ہے اس کے خلاف رسول اللہ ﷺ آئے اور انہوں نے آکر نہ صرف پچھلے ارتفاقات کی کمزوریوں کو ختم کیا بلکہ ارتفاق رابع کو بھی آپ نے ایک ترقی یافتہ شکل دی جس کی چھ

www.rahimia.org

شروعات اور بنیادیں اور عناصر حضرت ابراہیم علیہ (الملا) کے ذریعہ سامنے آچکے تھے لیکن اس پر ایک باقاعدہ معاشرہ کی تشکیل رسول اللہ ﷺ کے دور میں ہوئی۔ اس طرح گویا قانون ارتقاء کو ہم اس میں کارفرما دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد یہ قانون ارتقاء ہمیں پوری اسلامی تاریخ میں نظر آتا ہے اس طرح معاشروں کے اندر تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں جب ہم اس قانون ارتقاء کو سامنے رکھیں گے تو پھر ان تبدیلیوں کو ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو معاشرہ کے اندر آتی رہی ہیں۔

قانون عصبیت:۔

اس ارتقاء کے حوالے سے تبدیلی کا عمل کیوں پیدا ہوتا ہے اس چیز کو سمجھانے کے لیے ابن خلدون نے دو اصطلاحات کی مدد لی ہے ایک اس نے قانون عصبیت کا ذکر کیا ہے کہ جب بھی کوئی نظام چلتا ہے تو اس کے چلنے میں بہت اہم کردار عصبیت کا ہوتا ہے کہ عصبیت ہی اس نظام کو سنبھالتی ہے چنانچہ جب ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں دیکھتے ہیں تو قریش کی عصبیت نے ہی اس نظام کو سنبھالا اس لیے آپؐ نے فرمایا تھا **الآئمة من قریش** کہ یہ ان کی عصبیت ہی تھی جس کی وجہ سے امامت ان کے لائق قرار پائی کہ یہ اس کو سنبھال سکتے ہیں۔ اس کا تعلق کسی تشریعی حکم سے نہیں کہ آپ ﷺ کوئی ارشاد ایسا فرما رہے ہیں جو لوگوں پر لازمی ہو رہا ہو بلکہ آپ ﷺ ایک حقیقت بیان کر رہے ہیں۔ کہ امامت و قیادت قریش میں ہوگی چنانچہ قریش کی اجتماعی قیادت ہی اس نظام کو آگے لیکر چلی، چنانچہ خلافت راشدہ کے دور میں جو عصبیت تھی وہ قریش اور انصار کی اجتماعیت پر مبنی تھی۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی اجتماعیت نظریاتی دینی اجتماعیت ہے جب اس اجتماعیت کے افراد دنیا سے اٹھنا شروع ہو گئے جس کو ابن خلدون جیل (نسل) کا نام دیتا ہے کہ ایک جیل ختم ہو رہی تھی اور ایک نئی جیل پیدا ہو رہی تھی تو گویا کہ جب ایک نیا دور شروع ہو رہا تھا تو اس میں عصبیت بھی منتقل ہوئی کہ دینی عصبیت کی حامل جماعت کے افراد کم ہو گئے اب اس کی جگہ ان حالات میں جو عصبیت موجود تھی وہ اموی قبیلہ کے پاس تھی اس لیے لازماً یہ نظام اس کے ہاتھ میں جانا تھا اس کے علاوہ کوئی اور صورت موجود ہی نہیں تھی کوئی بھی اور متبادل صورت اختیار بھی

www.rahimia.org

کی جاتی وہ زیادہ عرصہ نہیں چل سکتی تھی وہ ایک آئیڈیل ازم تو ہوسکتا تھا لیکن اس کا گرد و پیش کے حقائق سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔

غرض یہ ایک بنیادی چیز ہے جس جگہ پر جو عصبیت موجود ہوگی نظام اس کے ہاتھ میں ہوگا چنانچہ اموی دور کے اندر ہم دیکھتے ہیں کہ نظام کا جو کردار رہا ہے اس میں مجموعی طور پر دین کے غلبہ کا رہا ہے کہ دنیا کے اندر فتوحات اسی طرح قائم رہیں بلکہ آگے بڑھتی رہیں اور اندرونی طور پر معاشی نظام اسی طرح فعال رہا وہاں پر کوئی بڑا فساد برپا نہیں ہوا تاہم جو تبدیلی آئی وہ طرز حکومت میں آئی کہ پہلے ایک نظام موجود تھا اس کی جگہ پر اموی نظام آیا اور اموی نظام میں یہ جو سلسلہ وراثت ہے جس کو ملوکیت کہا جاتا ہے یہ قبیلہ کے نظام کی ایک لازمی ضرورت تھی۔ چنانچہ خود حضرت امیر معاویہؓ نے جب یہ مشاورت کی کہ نظام آگے کیسے چلے گا تو ان کو مشورہ یہی ملا تھا کہ اگر اس کو آپ اپنے خاندان میں منتقل کریں گے تو یہ اجتماعیت رہے گی ورنہ یہ شیرازہ بکھر جائے گا یہ ایک معروضی یا زمینی حقیقت ہے تو اس وجہ سے اموی عصبیت کی بنیاد پر اس نظام نے آگے ترقی کی اور یہی وجہ ہے کہ یہی اموی لوگ ہیں جنہوں نے آگے جا کر اسپین کا نظام سنبھالا وہ صلاحیت کی بنیاد پر اس نظام کو سنبھالنے کے اہل تھے محض طاقت کے بل بوتے پر یا محض زبردستی یا زور کی بنیاد پر یہ نظام نہیں چلا۔ باقی اس دور میں جو کچھ واقعات ہوئے ان کی افسوسناک حقیقت کا ہم انکار نہیں کر سکتے ان واقعات کی یقیناً ہمارے پاس کوئی ایسی صفائی موجود نہیں ہے جو ہم دے سکتے ہوں لیکن ایک چیز بہرحال سمجھ میں آرہی ہے کہ جو سانحے ہوئے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ دوسری طرف مطلوبہ عصبیت موجود نہیں تھی اس دور میں کوفہ میں جو نام نہاد مذہبی عصبیت بیان کی جاتی تھی اسی نے ہماری محترم و مقدس شخصیات کو سب سے زیادہ دھوکہ بھی دیا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کا خانوادہ شہید ہوا اور ان کو اگر ان حقائق کا پہلے سے علم ہوتا تو شائد نتائج مختلف ہوتے جیسا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے متعدد مواقع پر اس کا اظہار بھی کیا۔ اسی سے سمجھ میں آرہا ہے کہ جو مذہب کے نام سے ایک عصبیت بتائی جاتی تھی یا جماعت بتائی جاتی تھی اس کا کوئی حقیقی وجود نہیں وہ محض ایک تصوراتی ابھار تھا جس کو حقائق نے بے بنیاد

ثابت کیا اسی طرح جب ہم اموی دور کے بعد عباسی دور کے آنے کا جائزہ لیتے ہیں تو وہاں بھی یہی بنیاد نظر آتی ہے کہ عصبیت منتقل ہوگئی کہ اس عصبیت کا دائرہ وسیع ہوا کہ عباسی لوگوں نے اپنے ساتھ عجمیوں کو بھی شامل کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے ہاں قوت کا دائرہ زیادہ وسیع ہوگیا اور وہ اس قابل ہو گئے کہ اموی حکومت کو ختم کر سکیں۔

قانون جیل:۔

گویا قانون ارتقاء کے اندر ہمیں ایک عمل آگے بڑھنے کا نظر آتا ہے اس کو ابن خلدون نے کہا ہے کہ ایک ''جیل'' چالیس سال کے بعد بدلتی ہے گویا اس نے ایک عرصہ دیا ہوا ہے ضروری نہیں کہ ہم اس کے چالیس کے ہندسہ سے اتفاق کریں اصل بات یہ ہے کہ اس نے ایک تصور دیا ہے کہ جس طرح انسانی شخصی عمریں ہوتی ہیں اسی طرح قوموں کی بھی ترقی کی عمریں ہوتی ہیں کچھ جدوجہد کا عرصہ ہوتا ہے کچھ غلبہ اور ترقی کا پھر ٹھہراؤ آجائے تو استحکام کا کچھ عرصہ ہوتا ہے اس کے بعد وہ زوال کی طرف چلی جاتی ہیں اگر حالات پر ان کی گہری نظر نہیں ہوتی۔ تو گویا کہ قانون ارتقاء اس میں ایک بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اب اسی ضمن میں یہ چیز بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ قانون ربط کے حوالے سے یہ عرض کیا گیا تھا کہ معاشرہ کے مختلف شعبے آپس میں جڑے ہوئے ہیں لہذا جب ہم کسی بھی علاقے کا، کسی بھی خطے کا، سیاسی نظام زیر بحث لاتے ہیں یا حکومت میں تبدیلیاں دیکھتے ہیں تو اس میں ہمیں صرف یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ پہلے کون تھا اس کے بعد کون آیا بلکہ ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کے پیچھے معاشی عوامل کیا ہیں؟ اس کے پیچھے جغرافیائی عوامل کیا ہیں؟ کیونکہ سیاسی تبدیلی کے آنے میں ان عوامل کا بھی بہت اہم کردار ہوتا ہے چنانچہ اسی وجہ سے ابن خلدون نے معاشی مسائل پر گفتگو کی اور خاص طور پر دو بنیادی قوانین کی طرف توجہ دلائی ہے: ایک قانون محاصل، دوم قانون محنت۔

قانون محاصل:۔

قانون محاصل سے ہمیں پتہ چلے گا کہ اس معاشرے کے اندر ترقی کی نوعیت کیا ہے؟ اگر معاشرے کے اندر قانون محاصل ایسا ہے کہ ہر چیز پر ٹیکس لگا ہوا ہے اور لوگوں کی جو بھی جائز

معاشی جدوجہد ہے اس کو ایک طبقہ لوٹ رہا ہے اور اپنے وسائل جمع کر رہا ہے۔ یوں معاشرہ کے اندر اگر کمانے والے طبقہ پر زیادہ ٹیکس لگا دیے جائیں تو اس معاشرہ کے اندر جمود پیدا ہو جاتا ہے یعنی جو کماؤ طبقہ ہے اس پر ٹیکسز آجائیں اور ایک طبقہ ان ٹیکسز کی بنیاد پر اپنی پرورش کرنے لگے۔ تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس معاشرہ کے اندر اب قانون ارتقاء رُک چکا ہے اب وہاں پر تبدیلی کا عمل لانے کے لیے کوئی نہ کوئی ذریعہ اور کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔

قانونِ محنت:۔

اسی طرح معاشرہ کی معاشی سرگرمیوں میں جو چیز اصل کردار ادا کرتی ہے وہ محنت ہے، محنت سے ہی معاشرے کے اندر نکھار پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ زراعت سے محنت کو نکال دیں زراعت ختم ہو جائیگی، صنعت کو اگر ہم محنت کی بنیاد پر نہیں چلائیں گے صنعت کا وجود بالکل ختم ہو جائے گا اس لیے تمام معاشی اعمال کا دارومدار انسان کی محنت پر ہے، اگر محنت کا عمل معاشرے کے اندر ختم کر دیا جائے تو وہاں پر وسائل پر محض قبضہ کی صورت ہے اور اگر ان وسائل سے مزید وسائل نہیں پیدا کیے جا رہے اور ان وسائل کو محنت کی بنیاد پر فروغ نہیں دیا جا رہا تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ معاشرہ کے اندر جمود پیدا ہو جائے گا اس لیے معاشی عوامل کو بھی پیش نظر رکھنا بڑا ضروری ہے۔

جب مسلم دورِ عروج، دورِ زوال میں تبدیل ہوا تو اس میں یہی چیز نظر آتی ہے کہ جب تک وہاں پر ایک صالح عصبیت اس نظام کو سنبھالنے کے لیے موجود رہتی تھی وہ نظام تھوڑے بہت ردوبدل کے بعد پھر آگے ترقی کے لیے چل پڑتا تھا چنانچہ جب مکمل طور پر عربوں کی نااہلیت ثابت ہوگئی تو نظام ترکوں کے پاس آیا اور ترک اس کو اسی طرح عروج پر لے کر گئے چنانچہ ترکوں کے ذریعے ہی مسلمانوں کو مشرق کی جانب سے یورپ میں جانے کا موقع ملا اور آج یورپ کے اندر جتنی بھی مسلمان آبادیاں موجود ہیں وہ اس دور کی یادگار ہیں جب وہاں پر ترکوں کی حکومت ہوا کرتی تھی۔ اور یہ اس دور کی سُپر پاور سمجھی جاتی تھی اس کے بعد ایک زوال کی کیفیت پیدا ہوئی ظاہر ہے کہ جنگ عظیم اول سے پہلے ہی زوال کا آغاز ہو چکا تھا کیونکہ

اچانک کبھی بھی زوال نہیں آیا کرتا بلکہ زوال کی کچھ بنیادیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

قانون ارتفاق اور ولی اللہی جدوجہد:۔

اب اسی زوال کے ہی دور میں حضرت امام شاہ ولی اللہؒ کی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے کہ انہوں نے مذکورہ قوانین کے علاوہ قانون ارتفاق کی بات کی انہوں نے پورے انسانی معاشرہ کو آدم علیہ السلام سے لیکر اپنے دور تک اس طرح مربوط کر دیا کہ یہ ارتفاقات کا عمل ہے جو مد و جزر سے دوچار ہے گویا قانون ارتقاء نے ارتفاق میں کردار ادا کیا کہ اول سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے اور تیسرے سے چوتھے ارتفاق کا عمل چلتا رہا ہے۔ اور جب بھی ایک ارتفاق کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے تو اگلے ارتفاق کی بنیادیں استوار ہونا شروع ہو جاتی ہیں گو اس کی شروعات گزشتہ ارتفاق میں ہی ہو جاتی ہے اور جب کسی ارتفاق میں زوال آنے لگتا ہے تو پھر وہاں پر ضروری ہو جاتا ہے کہ اس سے پہلے کے ارتفاق کو مضبوط کیا جائے۔ یوں دیہی، شہری، قومی اور بین الاقوامی سماجی مراحل سے انسانی معاشرہ گزرتا ہے۔

تاریخ کے عمل کو جب تک ہم صحیح طور پر سمجھیں گے نہیں تو ظاہر ہے کہ ہم اس وقت تک اپنے حال کا صحیح تجزیہ نہیں کر سکتے اور مستقبل کے لیے ہماری صحیح منصوبہ بندی نہیں ہو سکتی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ نے جہاں اپنے دور میں یہ فیصلہ کیا کہ یہاں پر اب صورت حال اتنی بگڑ چکی ہے کہ یہ معاشرہ اب ان بنیادوں پر مزید قائم نہیں رہ سکتا چنانچہ ایک نئی بنیاد قائم کرنے کی ضرورت ہے جس پر انہوں نے کام کیا اور باقاعدہ اس کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا اور اس کا ایک نصاب بنایا وہاں دوسری طرف یہ بھی چیز ان کے پیش نظر تھی کہ انقلاب کو قائم رکھنے کے لیے یہاں پر ارتفاق کی جو موجود سٹیج (مرحلہ) ہے اس کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے تاکہ معاشرہ کے اندر انارکی پیدا نہ ہو یہ بہت اہم چیز ہے کہ معاشرہ میں تبدیلی لانے والے لوگ کبھی بھی معاشرے میں انارکی پیدا نہیں کریں گے۔ یہی فرق ہوتا ہے انقلاب اور انارکی میں یا فساد میں۔

انقلاب اس چیز کا نام نہیں ہوتا کہ معاشرہ کے اندر افراتفری پیدا کر دی جائے،

www.rahmia.org

افراتفری اور فساد مچانا اتنا مشکل کام نہیں کہ کوئی بھی چھوٹا سا منظم گروہ معاشرہ کے اندر افراتفری پیدا کر سکتا ہے لیکن اس کو انقلاب نہیں کہا جائے گا۔ انقلاب تو اس عمل کا نام ہے کہ قانون ارتقاء جو جمود کا شکار ہو چکا ہے اس کو دوبارہ جاری وساری کیا جائے اس کو دوبارہ جاری وساری کرنے میں ایک قوت کی ضرورت پیش آتی ہے تاکہ پچھلے جمود کو توڑا جائے اور اس رکاوٹ کو دور کر کے اس کی جگہ پر ایک صالح عنصر پیدا کر کے اس کام کو آگے بڑھایا جائے چنانچہ شاہ ولی اللہؒ دیکھتے ہیں کہ ان کی اپنی جدوجہد ابتدائی مرحلہ میں ہے اور دوسری طرف صورتحال یہ پیدا ہو رہی ہے کہ معاشرہ بالکل بکھرنے کی طرف جا رہا ہے۔ اب ایسی صورت میں انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی، جو لوگ تاریخ کے قوانین کو نہیں سمجھتے اور فلسفہ تاریخ کو نہیں جانتے وہ اس پر بڑا اعتراض کرتے ہیں کہ ایک طرف شاہ ولی اللہؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ انقلابی تھے اور دوسری طرف وہ باہر سے ایک حکمران کو اپنے ملک کے لوگوں سے لڑنے کے لیے بلا رہے ہیں تو بات یہ ہے کہ وہ باہر سے اسے اپنے ملک کے لوگوں سے لڑنے کے نہیں بلا رہے بلکہ اپنے ملک کے ایک حصے سے (اس دور میں افغانستان ہندوستان سے جڑا ہوا تھا) ان قوتوں سے لڑنے کے بلا رہے ہیں جو معاشرہ کے اندر انارکی پیدا کر رہے ہیں مرہٹہ، سکھ اور جاٹ یہاں کی مقامی قوتیں یقیناً تھیں لیکن یہ مقامی قوتیں صالح قوتیں نہیں تھیں بلکہ یہ تنگ نظر گروہ تھے یہ اسی طرح کے ٹولے تھے جس طرح کے ٹولے، گینگ اور مافیا ڈاکوؤں کے پیدا ہو جاتے ہیں جن کا کام لوٹ مار ہوتا ہے اور کوئی پیداواری مقصد نہیں ہوتا۔ اگر یہ مقامی قوتیں قومی درجے کی ہوتیں اور پھر شاہ ولی اللہؒ ان کو ختم کرنے کے لیے کسی کو بلاتے تو پھر اعتراض کی بات ہوتی جبکہ شاہ ولی اللہؒ کے پیش نظر صرف یہ بات تھی کہ یہ معاشرہ اگر مزید بکھرے گا تو اس سے مزید مسائل پیدا ہوں گے اور ہم مزید نیچے چلے جائیں گے کہ کہیں معاشرہ ارتفاق ثانی تک نہ پہنچ جائے لہذا کم سے کم اس کا ارتفاق ثالث (ریاستی نظام) کا جو وجود ہے وہ کسی حد تک قائم رہے تاکہ اس دوران ہم ایک نئی تبدیلی کے لیے اپنی تیاری کا عمل مکمل کر لیں، دراصل اس دور کی صورتحال کا یہ پس منظر تھا۔

جب شاہ ولی اللہؒ دنیا سے چلے گئے اور زوال کا عمل مزید آگے بڑھتا چلا گیا تو شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے پاس اس جماعت کی قیادت آتی ہے جس نے یہ فیصلہ کیا ہوا ہے کہ ہم نے معاشرہ کے اندر خود تبدیلی لانی ہے اور ایک نیا نظام خود پیدا کرنا ہے مگر ساتھ ہی معروضی حقائق پر بھی اس کی نظر ہے۔ واضح رہے کہ تاریخ کو سمجھنے میں معروضیت کا ایک بڑا اہم کردار ہے کہ محض موضوعی طور پر تاریخ کو دیکھنے کی وجہ سے مسائل پیدا ہوتے ہیں چنانچہ پسند و ناپسند اور اپنے اپنے ذہن میں کسی کے بارے میں اچھائی اور برائی کے تصورات نے تاریخ کو نہ سمجھنے میں ہمیں بہکایا اور بھٹکایا ہے۔ جبکہ معروضیت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ کو گرد و پیش کے حقائق کا اندازہ ہو چنانچہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ دیکھ رہے تھے کہ نظام اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ باہر کی قوت اس میں عملاً دخیل ہو چکی ہے۔ اب نظام اصل میں اس کے ہاتھ میں ہے۔ اعلان ہوتا ہے کہ یہاں بادشاہ تو موجود ہے اور اللہ کا بھی نام لیا جا رہا ہے کہ خلق خدا کی ہے لیکن حکم اور فیصلہ ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کا ہے۔ ان حالات میں شاہ عبدالعزیز دہلویؒ قابل غور فیصلہ کرتے ہیں چنانچہ ایک طرف تو وہ اعلان کر دیتے ہیں کہ ہمارا نظام ختم ہو چکا ہے۔ اب ہمیں ایک نئے سرے سے تنظیم سازی کے عمل سے گزر کر نظام تک پہنچنا ہے تو انہوں نے تنظیم سازی کے تقاضے کے مطابق اپنا کردار ادا کیا چنانچہ عوام الناس کی تربیت اور ذہن سازی کا عمل شروع کیا۔

دوسری طرف جو بڑی دلچسپ بات ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کے بارے میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ مرہٹہ کے خلاف احمد شاہ ابدالی کو بلایا جبکہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ ایک مرہٹہ سردار کے ساتھ مل کر باہر کی قوت کو روکنے کے لیے ایک معاہدہ کرتے ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ اگر مذہبی تعصب کی بنیاد پر شاہ ولی اللہؒ نے کوئی فیصلہ کیا ہوتا تو شاہ عبدالعزیز دہلویؒ بھی اسی مذہبی تعصب پر قائم رہتے کہ ہماری مرہٹہ سے کوئی بات نہیں ہو سکتی لیکن ان کے سامنے ایک معروضی حقیقت یہ ہے کہ یہاں پر اب ہمیں ایک باہر کی قوت سے مقابلہ کرنا ہے اور اس باہر کی قوت سے مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں یہاں کی مقامی قوتوں کے ساتھ مل بیٹھنا ہوگا چنانچہ سید احمد شہیدؒ کے ذریعے مرہٹوں کے ساتھ رابطہ ہوا اور یہ بات طے پا گئی کہ ہمارے جو اختلافات ہیں

ان کا اب یہ موقع نہیں ہے بلکہ اب موقع اس بات کا ہے کہ ہم باہر کی قوت کے مقابلہ پر اپنی طاقت کو مجتمع کریں تو گویا حزب ولی اللہی یعنی شاہ ولی اللہؒ کی جماعت میں ان تاریخی اصولوں کا عمل دخل نظر آتا ہے کہ محض یہ پچھلی تاریخ ہی کا تجزیہ نہیں کر رہے کہ کس قانون کی کارفرمائی ہے یا کس قانون کی نہیں بلکہ وہ خود گرد و پیش کے حقائق کو دیکھ رہے ہیں اور ان حقائق کے مطابق نئے فیصلہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ اگلے دور میں ہم ان تمام چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ پھر بالاکوٹ کی تاریخ کے بعد بھی جو جماعت یہاں بچتی ہے وہ اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق فیصلے کرتی ہے اور اپنی حکمت عملیوں کو بدلتی ہے وہاں پر آپ کو کسی بھی طور پر یہ چیز نہیں ملے گی کہ کسی چیز پر ان کا ذہن اٹک کر رہ گیا ہو یا اڑ کر رہ گیا ہو بلکہ آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ وہ تاریخ کو دیکھ رہے ہیں حالات کو دیکھ رہے ہیں اپنی حکمت عملیوں کو بدل رہے ہیں مثلاً 1857ء کے جبری یا اضطراری حالات میں کہ قومی نظام ٹوٹ چکا ہے ولی اللہی جماعت نے اپنا کردار ادا کیا اور ان حالات میں اس کو ایک عسکری کردار بھی ادا کرنا پڑا لیکن عسکری کردار میں ناکامی کے بعد انہوں نے فوراً دوسری حکمت عملی اختیار کی کہ ہمارا مزاحمتی محاذ فکری انداز سے آگے بڑھنا چاہیے چنانچہ فکری سرگرمیوں کے مرکز کے طور پر دیوبند ہمارے سامنے آتا ہے یہاں سے گویا کہ ایک عمل جس کو کہ بظاہر علمی عمل اور مدرسہ کا عمل کہا جاتا ہے لیکن وہ بذات خود ایک تیاری کا عمل ہے اور اس میں بھی بنیادی طور پر وہی فکر، وہی فلسفہ، وہی سوچ، وہی جماعت کی تیاری، وہی تنظیم، وہی ثمرۃ التربیت، وہی جمعیت الانصار اور وہی نظارۃ المعارف یوں سارا سلسلہ وہاں پر چلتا ہے۔

اب یہاں پر ایک اور دلچسپ بات حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے حوالہ سے ہے کہ یہ لوگ بین الاقوامی صورتحال کے کتنے ماہر تھے بظاہر ایک چھوٹے سے قصبے میں بیٹھے ہوئے لوگ ہیں، بظاہر ان کے سامنے پرانی کتابیں موجود ہیں اور عام آدمی سمجھتا ہے کہ پرانی باتیں پڑھاتے ہیں مگر وہ اتنے صاحب شعور ہیں کہ ایک طرف تو یہ سوچتے ہیں کہ خلافت عثمانیہ کے بین الاقوامی نظام کے لیے ہم اپنا کیا کردار ادا کر سکتے ہیں، اس کے لیے ہم کس طرح مدد مہیا کر سکتے ہیں اور اس کے تعاون سے ہم یہاں پر کیا بہتری لا سکتے ہیں چنانچہ تحریک ریشمی

رومال کے حوالہ سے پورا ایک منصوبہ تیار ہوتا ہے۔ اگر ان حالات کے اعتبار سے اس تحریک اور اس منصوبہ پر جب ہم غور کریں تو یقیناً اس کی ایک معنویت بنتی ہے اور وہ منصوبہ اگر کامیاب ہو جاتا تو یقیناً ایک بہت بڑی تبدیلی کا عمل ہوتا مگر حالات نے ساتھ نہ دیا۔ چنانچہ حالات کے بدلنے کے بعد یہی لوگ فیصلہ کرتے ہیں قومی جدوجہد کا آغاز کیا جائے اس کو کہا جاتا ہے تاریخی شعور اور اس کو کہتے ہیں عصری شعور، جو روح عصر کو سمجھنے والے کے پاس ہوتا ہے۔

روح عصر:۔

تاریخ کے اندر اصل چیز یہی ہے اور فلسفہ تاریخ اسی چیز کا نام ہے کہ آپ روح عصر کو سمجھیں کہ اس دور کی روح عصر کیا تھی اور اس دور کے مطابق اس دور کی اجتماعیت نے کیا کردار ادا کیا۔ اچھا کردار تھا، برا کردار تھا یا کمزور کردار تھا۔ روح عصر کے مطابق ہی یہ فیصلہ ہوگا۔ ہمارے ہاں تاریخ کے حوالہ سے بہت بڑی خامی ہے کہ آج کے ماحول اور حالات کو دیکھ کر ہم پچھلے دور پر تنقید شروع کر دیتے ہیں مثلاً آج کے دور میں انتخابی جمہوریت کی بات ہوتی ہے موجودہ جمہوری دور کی صورت کو سامنے رکھا اور تنقید شروع کر دی کہ فلاں دور میں ملوکیت موجود ہے بات یہ ہے کہ آپ اس زمانے میں جا کر ہمیں سمجھائیں کہ اس دور میں اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا محض ایک کہانی بنا لینا یا ایک افسانہ بنا لینا وہ تو بہت آسان ہے۔ بات یہ ہے کہ اس دور کے ماحول میں اس کی کتنی گنجائش موجود ہے اس لیے جب بھی کوئی مورخ ہمارے ہاں تاریخ لکھتا ہے وہ عموماً اپنے ماحول کا اسیر ہوتا ہے اور اپنے ماحول کے اثرات اس پر موجود ہوتے ہیں چنانچہ آج کے نعرے اور آج کے افکار اس کے ذہن پر مسلط ہوتے ہیں ان کی روشنی میں وہ پچھلے ادوار کو دیکھنا شروع کر دیتا ہے اسکو پھر حضرت معاویہؓ ڈکٹیٹر نظر آتے ہیں ان کے بارے میں وہ غلط زبان بھی استعمال کرتا ہے اور غلط بیانی بھی کرتا ہے، لہٰذا اصل چیز یہی ہے کہ ہر دور کی روح عصر کو سمجھ کر اس دور کا فیصلہ کیا جائے کہ اگر اس دور کی روح عصر کے تقاضوں کو کسی نے پورا نہیں کیا یقیناً وہ ذمہ دار بنے گا اور اگر اس نے اس دور کے تقاضے کو پامال نہیں کیا تو وہ پابند نہیں ہے کہ آج سے تیرہ چودہ سو سال کے بعد کی جمہوریت کا خیال رکھے اور اس کے قائم کردہ ڈھانچے کا جھنڈا اٹھا کر چلے۔

دراصل روح عصر سے روگردانی کرنے والے حالات کو سمجھتے ہی نہیں مثلاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دور میں بغاوت کرنے والے خوارج کو دیکھیں تو خوارج کی یہ بات بڑی خوبصورت لگتی ہے کہ حکم اللہ کا ہوگا، حکومت الہیہ کا نعرہ سب سے پہلے خوارج نے لگایا۔ اورر وزمرہ کے معاملات میں انسانی دانش کو فیصل ماننے سے انکار کردیا تو وہ فیل ہوگئے حالاں کہ بڑے مخلص لوگ تھے اور چھوٹی چھوٹی بات پر قربانی دینے والے لوگ تھے مگر محض اخلاص سے کوئی بات نہیں بنتی جب تک شعور موجود نہ ہو تو بے شعور مخلص لوگ ہمیشہ خود بھی تباہ ہوتے ہیں اور معاشرے کے اندر تباہی کا باعث بھی بنتے ہیں کہ وہ روح عصر سے نابلد ہوتے ہیں۔ اسی لیے بنیادی چیز تاریخ کو سمجھنے میں ہمیشہ روح عصر کا لحاظ کرنا ہوتا ہے۔ ولی اللہی سلسلہ کا امتیاز یہی ہے کہ وہ روح عصر کو سمجھتے ہیں جبکہ دیگر مذہبی لوگوں کو بات سمجھ میں نہیں آتی ان کا المیہ کیا ہے؟ دراصل انکا ذہن آج سے پانچ چھ سو سال سے پہلے کے زمانہ میں رُکا ہوا ہے اب وہ آج کے دور کے تقاضوں کو نہیں سمجھ پا رہا۔ آج کے دور کے تقاضے کی کوئی بات کرتا ہے تو اسے وہ بدعت محسوس ہوتی ہے یا اسے وہ الحاد محسوس ہوتا ہے جبکہ اصل میں خامی یہ ہے کہ ہم روح عصر کو نہیں سمجھ پاتے اگر روح عصر کو ہم سمجھ لیں گے تو پھر یقیناً ہمیں تاریخ کے مدوجزر سے بھی واقفیت ہوگی اور آج کے دور کے تقاضوں کو بھی ہم سمجھ سکیں گے مثلاً آج کے دور کے اندر جب ہم خلافت کا نعرہ بلند کرتے ہیں اور اس کے مفہوم میں تاحیات استبدادی حکمرانی کو شامل کردیتے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ یہ نعرہ یقیناً آج کے دور کے تقاضے سے بالکل ہٹ کر ہے۔

اب کوئی کہے کہ آپ کے بزرگوں نے بھی تو تحریک خلافت میں کام کیا۔ تو بات یہ ہے کہ آپ اس دور کے حالات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس دور میں خلافت عثمانیہ، ایک بین الاقوامی قوت کے طور پر موجود ہے اس کو دنیا میں برطانوی سربراہی میں اتحادی ملکوں سے مقابلہ درپیش تھا اور ایک سیاسی وعسکری جنگ ہو رہی تھی اس سیاسی جنگ میں متوازن کردار ادا کرنا سامراج کے مقابلہ کے لئے ضروری تھا جبکہ آج خلافت کا نعرہ، استبدادی سوچ رکھنے والوں کا حربہ ہے، جس کا مقصد عوامی شعور کو پامال کر کے علی الرغم حکومت قائم کرنا ہے۔ تو اس کا

مطلب یہ ہوگا کہ ہم معاشرہ کے اندر ان قوتوں سے لڑنا چاہتے ہیں جو معاشرہ کے اندر تبدیلی کے عمل کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ ہم اس دور کی جمہوریت پر خود کیوں نہیں غور کر لیتے اس کی جو غیر مفید یا منفی چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں ان پر ہم تنقید کریں اور ان کا بہتر متبادل دیں جو ہمیں دستیاب ہے اور اگر ان پر تنقید کرنے کے بجائے ہم اپنی طرف سے ایک تصوراتی ڈھانچہ کھڑا کریں گے تو وہ اسلام کا ایسا تصور ہوگا جو کہیں نافذ نہیں ہوسکتا اس لیے بجائے اس کے کہ ہم روح عصر کے تقاضوں کا انکار کریں ہم ان تقاضوں اور ان کے مظاہر کا تجزیہ کر کے اس میں اچھے برے کا امتیاز پیدا کریں چنانچہ مسلمانوں میں بھی یونانی علوم آئے تو انہوں نے یونانی علوم کا انکار نہیں کیا انہوں نے یونانی علوم کو عربی میں منتقل کر کے اس کے بعد اپنا علم پیدا کیا جس نے فیصلہ دیا کہ یونانی علم میں کتنی صالح چیزیں ہیں کتنی اس کی منفی چیزیں ہیں اور اگر وہ اپنے کان ، آنکھ اور اپنی سب چیزیں بند کر کے بیٹھ جاتے تو ظاہر بات ہے کہ وہ علم اپنی جگہ پیدا کر لیتا اور مسلمانوں کا یہ انیسویں صدی تک کا جو دور رہا ہے یہ چند سالوں سے آگے نہ بڑھتا۔

الغرض ہر دور میں ایسے تقاضے پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہر دور کے بصیرت رکھنے والے اہل علم و دانش نے ان تقاضوں کو سمجھا ہے۔ اسی کو روح عصر کہا جاتا ہے اور روح عصر کو سمجھنا ہی دراصل فلسفہ تاریخ ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے مذکورہ بالا قوانین کی ضرورت ہے ان قوانین کو اگر سمجھ لیا جائے تو یقیناً ہمیں ہر مد و جزر کی حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے اور پھر ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ کوئی قوم کتنی دیر زندہ رہ سکتی ہے اور اس کا زوال کس وجہ سے آتا ہے اس لیے اس قانون کے تحت دنیا کے اندر کسی بھی قوم کی برتری ہمیشہ کے لئے نہیں ہوتی کسی بھی قوم کی برتری کا جو زمانہ ہے وہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتا اس کا ایک دور ہوتا ہے اور وہ جب اس دور سے گزر جائے تو پھر وہ ایک بڑھاپے کے دور میں چلا جاتا ہے جیسے آج امریکہ اپنے بڑھاپے کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔ اب یہ زوال کی طرف جا رہا ہے بسا اوقات بڑھاپے کے اندر بڑھکیں بھی لوگ مارا کرتے ہیں اور امریکہ کی اب یہی کیفیت ہے اب اگر کسی کو قانون تاریخ کا علم نہ ہو تو وہ ان بڑھکوں سے خوفزدہ ہوتا پھرے گا لیکن اگر آپ تاریخی تناظر میں تجزیہ کریں تو آپ کو

پتہ ہے کہ کل اس کے ساتھ یورپ موجود تھا آج یورپ اس کے ساتھ نہیں کھڑا ہوا، وہ اس وقت علیحدہ ہے اس کے سارے ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ اب ایسا آدمی جس کی دنیا کے اندر ایک رعب اور دھاک بیٹھی ہوئی ہو۔ اس کے ساتھ کوئی بھی نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ بات بات پر اکڑے گا، وہ اپنا باز و دکھائے گا اور بار بار شور مچائے گا تا کہ لوگ اس کے رعب میں آئیں تو اگر آپ تاریخی عمل کو پیش نظر رکھیں گے تو آپ کو یہ بات بڑے واضح انداز میں سمجھ میں آجائے گی کہ اب یہ اپنے زوال کی طرف جا رہا ہے اس کا آخری زوال کوئی دور نہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ ہم روح عصر کو سمجھ کر اگلے دور کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں تو تاریخ کو اس طرح جب ہم سمجھنے لگیں گے تو تاریخ میں جو غلطیاں ہوئی ہیں ان سے بھی ہمیں سبق حاصل کرنے میں مدد ملے گی کہ کہاں کہاں غلطیاں ہوئیں اور تاریخ کے عمل کو جس طرح آگے بڑھایا گیا ہے اس کو بھی ہم صحیح طور پر سمجھ سکیں گے تو ہمیں روح عصر سے واقفیت بھی رہے گی اور ہم ہر دور کا اس کے اپنے پس منظر میں صحیح طور پر تجزیہ بھی کر سکیں گے۔

☆☆☆☆☆

www.rahimia.org